جدید اردو اور پنجابی غزل میں زندگی کا روایتی تصوّر

The Traditional Concept of Life in Modern Urdu and Punjabi Poetry

محمد مہدی، پی ایچ ڈی سکالر اردو، جی سی یونیورسٹی لاہور

سید صفدر حسین، ایسوسی ایٹ پروفیسر سرائیکی، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

Abstract

Ghazal is the most popular genre of poetry. Besides basic topics of ghazal. Some traditional topics also became a part of it. The transienty nature of the world is one of them. Under the influence of religious values and mysticism this topic was introduced in modern urdu and punjabi ghazal after the creation of Pakistan, with the tradition of classical ghazal. With the help of this traditional topic positive and negative effects can be witnessed on human temperament in modern ghazal. It highlights true meaning of human life and a man tries to make his brief span of life memorable through his actions. In this research paper, the continuity of the usage of this traditional topic in modern urdu and punjabi ghazal will be analysed. Furthermore, this topic will be compared to the ghazals of both the languages to highlight its intellectual harmony to demonstrate that ghazal is still depicting true ideology of human life.

Key Wordss: Ghazal, Urdu, Punjabi, Comparsion, Transient, Tradition, Modernism

جدید اردو اور پنجابی غزل کا ایک مشترک موضوع جو روایت کا تسلسل ہے وہ دنیا کی بے ثباتی کا موضوع ہے۔ غزل کی ابتدا ہی سے غزل گو شعراء کا دنیا کے بارے میں اور اس دنیوی زندگی کے بارے میں رویہ کچھ زیادہ مثبت نہیں رہا۔غزل میں دنیا کی بے ثباتی کا اور دنیاوی زندگی کو زیادہ اہمیت نہ دینے کا رویہ مذہبی اقدار اور صوفیانہ طرزِ عمل کا نتیجہ ہے۔اس کے علاوہ یہ تاریخی حقیقت بھی ہے کہ دنیا نے ہمیشہ کسی کا ساتھ نہیں دیا۔زندگی چندروزہ ہے اور دنیا کا اقتدار اور جاہ وجلال تو اس سے بھی کم ہے۔موت ایک اٹل حقیقت ہے۔اس سے انکار ممکن نہیں۔ یہ دنیا عارضی ہے اور موت کے بعد کی زندگی اٹل اور حقیقی زندگی ہے۔

کلاسیکی غزل میں دنیا کی بے ثباتی کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔تمام بڑے شعراء نے اپنے اپنے انداز میں دنیا کی

اس حیثیت کو اپنی غزل کا موضوع بنایا ہے۔ دنیا کے بارے میں اس فکری اور حقیقی مفہوم ہی سے انسان میں حرکت و عمل، وقت کی کمی کا احساس، موت کے بعد کی زندگی کو بہتر بنانے میں دلچسپی، خدمت خلق اور دھن دولت سے بیزاری کا مثبت رویہ سامنے آتا ہے جو اکثر بیشتر شعراء غزل میں بیان کرتے چلے آئے ہیں۔ اسی فکر سے انسان کا وہ بڑا دکھ اور المیہ بھی جنم لیتا ہے جو اس کے اشرف المخلوقات ہونے اور خوبصورت ترین ہونے کے باوجود بالآخر اپنی ہستی کو کھو دینا ہے۔ غالب جیسے ذہین شاعر نے اپنے دیوان کے پہلے شعر ہی میں انسان کے اس المیہ، اس دکھ کو گلے شکوے کے انداز میں انسان کی فریاد سے تعبیر کیا ہے کہ پیکرِ تصویر ہونے کے باوجود اس کا پیرہن کاغذی ہے۔

نقش فریادی ہے کِس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا [۱]

غالب کے ہمعصر شاعر محمد ابراہیم ذوق نے بھی دنیا کو ایک فنا کا رستہ قرار دیا ہے۔ جس میں وہ اکیلا اگلی منزل پر روانہ ہو جاتا ہے اور اس سفر میں کوئی بھی اس کا ساتھ دینے والا نہیں ہوتا۔

محمد ابراہیم ذوق لکھتے ہیں:

دنیا نے کس کا راہ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے

ہو عمرِ خضر بھی تو کہیں گے بوقتِ مرگ
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

خواجہ حیدر علی آتش بھی تصوف کے زیر اثر روحانی تصورِ حیات سے زیادہ متاثر ہیں اور آتش کی غزل میں اسی بنیاد پر بعض اوقات زندگی سے بیزاری اور زندگی کی بے اعتباری کا احساس نمایاں نظر آتا ہے۔ آتش کا یہ شعر دیکھیں۔

وعدۂ صادق تو عزرائیل سے ہے دیکھیے
اِس سرا سے مجھ کو کب تک اُس سرا لے جائے گا [۲]

دنیا کے چندروزہ ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ جب ہم اس دنیا کا آخرت کی دنیا سے موازنہ کرتے ہیں تو آخرت کی دنیا کا دورانیہ تو لامحدود ہے۔ وہ دائمی ہے اور اس کی کوئی حد یا کنارہ نہیں ہے۔ جبکہ دنیا کی زندگی عام طور پر پچاس سال سے لیکر ایک صدی تک دیکھنے میں آ رہی ہے اور اگر کچھ زیادہ بھی ہو جائے تو چند سالوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تو اس طرح اخروی زندگی کے مقابلے میں یہ زندگی اور یہ دنیا کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس لیے اس کو چندروزہ

قرار دیا گیا ہے۔

دنیا کی بے ثباتی کی دوسری دلیل یہ ہے کہ موت کسی وقت بھی آسکتی ہے۔اس میں پچاس سال یا ایک صدی کی عمر کو بھی عمل دخل نہیں ہے۔بندہ دنیا میں آتے ساتھ ہی اس دنیا سے چل بسے، بچپن میں ہی زندگی کا خاتمہ ہو جائے، جوانی میں ہی بلاوا آجائے یا فطری طور پر بڑھاپے میں جان جائے، کچھ پتہ نہیں ہے۔اس لیے غزل میں شعراء نے انسانی زندگی کو ایک سانس سے دوسرے سانس تک کا وقفہ بھی قرار دیا ہے یا پھر کئی اور طریقوں سے اس کو مختصر ترین ثابت کیا گیا ہے۔کبھی اس کو پلک جھپکنے کے دورانیے سے تعبیر کیا گیا کبھی شعلے اور شرارے کے بڑھکنے اور پھر اگلے لمحے بجھ جانے کی طرح خیال کیا گیا۔بہادر شاہ ظفؔر جو عمدہ شاعر بھی تھے۔شہنشاہ ہونے کے باوجود یہی کہنے پر مجبور ہوئے

روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفؔر
ایسی بستی سے تو ویرانہ بنایا ہوتا

تصوف اور مذہبی اقدار کے زیر اثر اس چند روزہ دنیا اور اس مختصر زندگی کو جاوداں بنانے کا ایک تصور یہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ اگر کوئی انسان زندہ جاوید ہونا چاہتا ہے تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ اپنی یہ زندگی وقف کر دے۔خدمتِ خلق میں گزری ہوئی زندگی حیاتِ جاوداں میں تبدیل ہوجاتی ہے۔فراق گورکھپوری کا شعر ہے کہ

حیاتِ چند روزہ بھی حیاتِ جاوداں نکلی
جو کام آئی کسی کے وہ متاعِ عارضی کب تھی

لیکن یہ خیال بھی انسان کے خوبصورت یاد بن کر دلوں میں زندہ رہ جانے کا تصوّر رہے۔حقیقی اور عام تصوّر وہی ہے جو زندگی کو مختصر ہونے اور دنیا کے بے اعتبار ہونے کا ہے۔

لہٰذا دنیا اور زندگی کی بے ثباتی اور اس سے وابستہ تمام موضوعات روایتی غزل سے جدید اردو اور پنجابی غزل میں داخل ہوئے۔قیامِ پاکستان کے بعد دنیا کے اور زندگی کے مسائل میں اضافے کے ساتھ ساتھ یہ تصور اور زیادہ پختہ ہوتے ہوئے نظر آتا ہے۔زندگی کی بے اطمینانی، اضطراب اور مسائل نے انسان کے اندر دنیا کی بے قدری کا احساس مزید پختہ کر دیا ہے۔

ناصر کاظمی نے زندگی کی اس کشمکش اور بے اطمینانی کو بڑے قریب سے دیکھا۔آن ہی آن میں زندگی کے کئی چراغوں کو گل ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا بھی اور اس دکھ کو دل سے محسوس بھی کیا۔ناصر کا زندگی سے اعتبار اٹھ گیا۔وہ زندگی اور موت کے اسرار و رموز سے واقف ہوگئے۔ان کے خیال میں سازِ ہستی کی صدا کسی بھی وقت ختم ہوسکتی ہے۔یہ شور کسی بھی وقت تھم جائے گا لہٰذا اس کی طرف بروقت دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ناصر لکھتے ہیں:

سازِ ہستی کی صدا غور سے سُن
کیوں ہے یہ شور بپا غور سے سُن

موت اور زیست کے اسرار و رموز
آ مری بزم میں آ غور سے سُن ۳

ناصر کاظمی کے خیال میں زندگی کی رفتار بہت تیز بھی ہے اور اثر انگیز بھی ہے۔ انسان دیکھتے ہی دیکھتے زندگی کی منازل طے کرتا چلا جاتا ہے اور وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوتا اور عمر کا سایہ ڈھل جاتا ہے۔ ناصر کا یہ مطلع دیکھیں:

رنگ دکھلاتی ہے کیا کیا عمر کی رفتار بھی
بال چاندی ہو گئے سونا ہوئے رُخسار بھی ۴

ناصر نے اس دنیا کو ایک مہمان سرائے کہا ہے اور انسان اس میں ایک مسافر یا مہمان کی طرح ہے جس کے کوچ کا کسی بھی وقت حکم ہوسکتا ہے۔ یہ دنیا مستقل ٹھکانہ نہیں ہے۔ جب بھی کوئی جنازہ اٹھتا ہے تو یہ دنیا خود اپنے بے اعتبار ہونے کا اعلان کر رہی ہوتی ہے۔

مہمان ہیں ہم مہمان سرا ہے یہ نگری
مہمانوں کو مہمان سرا کچھ کہتی ہے ۵

رؤف شیخ پنجابی غزل کا بڑا نام ہے۔ انھوں نے دنیا اور زندگی کے اس روایتی مفہوم کو اپنی غزل میں کئی جگہوں پر مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔ رؤف شیخ کا زندگی کے بارے میں یہی نظریہ ہے کہ یہ کسی وقت بھی ختم ہوسکتی ہے اور زندگی کا سفر کسی وقت بھی منزل سے ہمکنار ہوسکتا ہے۔ رؤف شیخ لکھتے ہیں:

دکھ حیاتی کلّا ساتھی کدھرے رُوپ وٹا نہ جاوے
ڈرناں رستے مُک نہ جاون کدھرے منزل آ نہ جاوے ۶

دُنیا کے مختصر ہونے سے جہاں انسان آخرت کے لیے عمل اور حرکت کی کوشش کرتا ہے وہاں دنیا سے بیزاری بھی پیدا ہوتی ہے۔ جس چیز پر اعتبار نہ ہو اس سے محبت اور پکا رشتہ پھر کیسے قائم ہوسکتا ہے۔ اس کے ساتھ اپنائیت کیسے پیدا ہوسکتی ہے۔ رؤف شیخ دنیا کے اس تصور کے بارے میں لکھتے ہیں۔

جے ایہو، ایہہ دنیا تیری
ایہنوں فیر سلاماں ست ۷

دنیا کی بے اعتباری دیکھ کر بعض اوقات انسان اپنے آپ سے بھی اکتا جاتا ہے۔زندگی کے سارے رنگ بے رنگ ہو جاتے ہیں۔ پھر کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔رؤف شیخ لکھتے ہیں:

چہرے تے بے انت اداسی جُثا تھکیا ہویا اے
انج لگدائے جیوں بندہ اپنے آپ توں اکیا ہویا اے ۸

رؤف شیخ جب اپنے سے پہلے لوگوں کی زندگی کا سورج ڈوبتے دیکھتے ہیں تو ان کو اپنی زندگی کی حقیقت کا خود بخود اندازہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنی زندگی کے کچے رنگ سے خود بھی خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔

بچیا اے کیہڑے روز دا سورج زوال توں
مینوں وی خوف آوندا اے اپنے کمال توں ۹

جب انسان کو دنیا کے چند روزہ ہونے کا یقین ہو جاتا ہے تو پھر بعض اوقات وہ ان چار دنوں کو یادگار بنانے کے لیے دوسروں کے لیے جینا شروع کر دیتا ہے۔وہ اس حیاتِ چند روزہ کو جاوداں بنانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے دل میں خدمتِ خلق کا بے پناہ جذبہ جنم لیتا ہے۔وہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتا ہے۔یہاں زندگی کا مختصر ہونے کے باوجود، بے اعتبار ہونے کے باوجود ایک مثبت تاثر اُبھرتا ہے اور زندگی سے بیزاری کسی حد تک کم ہو جاتی ہے۔زندگی کا یہ پہلو اگرچہ کم کم ہے لیکن غزل میں ایسی مثالیں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔رؤف شیخ زندگی کا یہ تاثر کچھ یوں قائم کرتے ہیں۔

ایتھوں دی ہُن کوئی وی صورت میری اکھ لئی اوپری نئیں
ہر چہرے تے میرا دکھ اے بھانویں شہر پرایا اے ۱۰

ایس ہنیرے دیوچ کدھرے تیرا روپ گواچے نہ
دیوا بن کے پلکاں دی باری وچ بلدا رہنا واں ۱۱

اپنے گھر دے نھیرے دا تے کدی خیال نئیں آیا
راہیاں دے لئی سڑکاں اتے دیوے بال رہیا واں ۱۲

پنجابی کی طرح جدید اردو غزل میں بھی دنیا کی بے ثباتی کا موضوع بہت عام ہے۔تقریباً ہر شاعر نے زندگی کا یہ پہلو اپنی غزل میں کسی نہ کسی انداز میں پیش کیا ہے۔جون ایلیا اپنے منفرد انداز میں دنیا اور زندگی کی بے اطمینانی کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں کہ دنیا میں جیتے جی فنا ہونے کا ڈر ہمیشہ میرے ساتھ رہا پھر بھی اگر کچھ جی لیا ہے تو غنیمت ہے۔

فنا ہر دم مجھے گنتی رہی ہے
میں اک دم کا تھا اور دن بھر رہا ہوں ۱۳

میں ایک لمحۂ موجود سے ، اِدھر نہ اُدھر
سو جو بھی میرے لیے ہے محال ہے شائد ۱۴

سوچتا ہوں کہ بھلا عمر کا حاصل کیا ہے
عمر بھر سانس لیے اور کوئی انبار نہیں ۱۵

زندگی مختصر اور محدود تو ہے لیکن جتنی ہے انسان کا اس کے اوپر بھی اختیار نہیں ہے۔ نہ ہمیں اپنی مرضی سے دنیا میں بھیجا گیا ہے اور نہ ہی اس دنیا کے چھوڑنے میں ہماری مرضی اور منشا شامل ہے۔ محمد ابراہیم ذوق نے کہا تھا کہ

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

لہٰذا اس مختصر سی زندگی کے حوالے سے بھی انسان کی مجبوری اور لاچاری انسان کی بے بسی ہی ظاہر کرتی ہے۔ اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود انسان کا اپنی کسی ایک سانس میں کمی بیشی کا اختیار نہیں ہے۔ وہ جینا چاہے تو جی نہیں سکتا۔ مرنا چاہے تو مر نہیں سکتا۔

جون ایلیا لکھتے ہیں:

ہوں رواں سوئے آخر دنیا
دم گزاری کی مجھ میں تاب نہیں ۱۶

انسان صحت وتندرست بھی ہو، جوان بھی ہو، وسائل اور گھر بار بھی ہو، رشتے ناطے اور دھن دولت بھی ہو لیکن پھر بھی ہر لمحے موت کا ڈر اور دنیا کی بے وفائی کا اندیشہ زندگی کے ساتھ رہتا ہے۔ جون ایلیا کے ہاں بھی یہ کیفیت دیکھی جا سکتی ہے۔

میں ہر لمحہ اس گھر سے
جانے والا لگتا ہوں ۱۷

ایک سانس سے دوسرا سانس لینے میں اگرچہ کوئی بظاہر مشکل نہیں اور نہ اس کے لیے انسان کو شعوری کوشش کرنا پڑتی ہے لیکن ایک سانس کے بعد دوسرے سانس کا یقین نہ ہونے کی وجہ سے یہ مختصر سا فاصلہ اور سفر بھی

بہت کٹھن اور دشوار ہونے لگتا ہے اور زندگی بے معنی ہوکر رہ جاتی ہے۔ جون ایلیا کا یہ شعر دیکھیں۔

درمیان دو نفس مرحلے ایسے ہیں کہ بس
کوئی مشکل نہیں در پیش، مگر ہے درپیش ۱۸

زندگی کی اسی کیفیت سے انسان کے لیے ہر لمحہ اضطراب، رنج، اندیشوں اور وسوسوں کی صورت حال موجود رہتی ہے جو واضح طور پر محسوس نہ ہونے کے باوجود لاشعور میں ٹھہراؤ پیدا نہیں ہونے دیتی اور انسان کو صبح شام بے چین رکھتی ہے۔ جو ایلیا کا یہ مطع دیکھیں۔

رنج ہے حالتِ سفر، حالِ قیام رنج ہے
صبح بہ صبح رنج ہے، شام بہ شام رنج ہے ۱۹

اور پھر زندگی کے خاتمے پر انسان جب پیچھے مڑ کے گذشتہ زندگی پر ایک نظر ڈالتا ہے اور دنیا میں اس کے ساتھ ہونے والے معاملات کو وقت کی آنکھ سے دیکھتا ہے تو ازل سے لے کر ابد تک اسے پوری زندگی ایک لمحہ اور ایک پل محسوس ہوتی ہے۔ اس کو یہی گماں گزرتا ہے کہ میں ابھی اس دنیا میں آیا تھا اور ابھی ہی اس دنیا کو چھوڑ ے بھی جا رہا ہوں۔ ان اشعار میں جون ایلیا کا یہ احساس بہت پختہ اور فطری معلوم ہوتا ہے۔

دل کی ہر بات دھیان میں گزری
ساری ہستی گمان میں گزری

ازلِ داستاں سے اِس دم تک
جو بھی گزری اِک آن میں گزری ۲۰

اختیار اور بے اختیاری کی کشمکش بڑی عجیب ہے۔ انسان کی خواہش تو یہی ہے کہ اس کا اپنی زندگی اور زندگی کے معاملات پر اختیار ہو لیکن اللہ کی طرف سے ایسا ممکن نہیں ہے۔ منظور وزیر آبادی زندگی کی اس بے اختیاری کیفیت کو بڑی شدت سے محسوس کرتے ہیں۔

میں اودوں سمجھاں گا میں آں وسنیک ایس جگ دا
مِلے گا اپنے تے جیہڑے دن اختیار مینوں ۲۱

اگر زندگی کے اوپر اختیار ہو تو انسان ماضی، حال اور مستقبل جس کو مرضی چاہے اپنے قریب کر لے لیکن یہاں بھی انسان مجبور ہی ہے۔ گزرا وقت کبھی دوبارہ آتا نہیں ہے۔ مستقبل کا پتہ ہی نہیں کہ ہے بھی کہ نہیں۔ لہٰذا پھر انسان لمحۂ موجود میں صرف رو دھو ہی سکتا ہے۔

بیتے لمحے جی کردا اک وار بلائیے

اپنے آپ نوں اپنا ای دیدار کرائیے۲۲

یہ خواہش تو ہو سکتی ہے مگر ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ پنجابی غزل میں دنیا کی رنگا رنگی کے باوجود اس پہ اختیار نہ ہونے کی وجہ سے دنیا کو منفی انداز میں ہی پیش کیا گیا ہے۔ منظور وزیر آبادی لکھتے ہیں۔

ہویا اے مینوں حکم تے اوس تھاں تے رہن دا

مِلدی نہیں جتھے کوئی علامت وی جیون دی ۲۳

دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی بے اختیاری سے ہی نظریہ جبر وقدر جنم لیتا ہے۔ کلاسیکی غزل میں بھی انسان کے مجبورِ محض ہی کے اشارے ملتے ہیں۔ اگر چہ جدید غزل میں زندگی کے حوالے سے زیادہ حرکت، جذبہ اور کام سے زندگی کو تبدیل کرنے اور آگے بڑھانے کی بات بھی ہے لیکن روایتی مفہوم میں قسمت اور تقدیر کی عملداری زیادہ ہے۔ میر تقی میر، غالب سب نے قسمت کی فوقیت اور برتری کو تسلیم کیا ہے۔ لہٰذا جدید غزل میں یہ روایتی تصور ہمیں اکثر و بیشتر نظر آ جاتا ہے۔

منظور وزیر آبادی لکھتے ہیں:

میری مجبوری تے لوکی خورے کاہنوں ہسدے نیں

مینوں تے نئیں نظر آؤندا دھرتی تے مختار کوئی ۲۴

قیامِ پاکستان کے بعد زندگی کے نئے ڈھانچے اور نئے تقاضوں کے تحت اور کچھ مشینی انداز کی زندگی نے اس کی تیزی اور ناقدری کے احساس کو اور زیادہ گہرا کر دیا ہے۔ اس دور کا انسان خود مشین بن کر رہ گیا ہے۔ جیتے جی اس کو زندگی کا احساس نہیں ہوتا اور ایک دم موت آ جاتی ہے۔ وقت کا ٹھہراؤ، ملنا، ملانا اور دھیما پن اب کہاں ممکن ہے۔ اسی وجہ سے جدید غزل میں یہ روایتی موضوع اور اس کے اسباب وسیع تر ہوتے چلے گئے ہیں۔

دنیا اور زندگی کی اس تیزی اور بے ثباتی کو خواتین اردو شاعرات نے بھی اپنے نازک اور کومل احساسات کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ اگر چہ اس احساس میں اتنی شدت نہیں لیکن پھر بھی دبا دبا سا احتجاج اور اضطراب ضرور موجود ہے۔ پروین شاکر خواتین شعراء میں نمائندہ شاعرہ ہیں۔ خواتین کا چونکہ گھر سے رشتہ وتعلق بھی گہرا اور فطری ہوتا ہے اس لیے پروین دنیا کو ایک گھر ہی تصور کرتی ہیں اور کہتی ہیں۔

معلوم، کہ چھوڑنا ہے اک دن

پھر بھی یہ لگن کہ گھر بنائیں ۲۵

لیکن اندر ہی اندر یہ خیال بھی موجود ہے کہ جب بالآخر ایک دن مٹی میں ہی جانا ہے اور دنیا کو ثبات نہیں ہے تو پھر ذرّے کو گھر بنانے کی سعی کیا معنی رکھتی ہے۔

خاک ہی اوّل و آخر ٹھہری
کر کے ذرّے کو گہر کیا کرتے ۲۶

دنیا کی بے ثباتی کا خیال جب انسان کے اندر پختہ ہو جاتا ہے تو اس کو ہر صبح، صبحِ قیامت اور ہر دن اپنا آخری دن ہی محسوس ہوتا ہے۔ ایسے میں بہت سے زندگی کے معاملات کو انسان ترجیح دینا ترک کر دیتا ہے اور دنیا کے حوالے سے اس کی سوچ میں واضح تبدیلی اور فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

پروین شاکر لکھتی ہیں:

ہر صبح جب کہ صبح قیامت کی طرح آئے
ایسے میں کون ہو گا جو سوچے ثبات کی ۲۷

فطری عمر گزارنے کے بعد جب انسانی جسم کے عناصر میں انتشار آتا ہے اور ہوش وحواس وتاب وتواں جا چکتے ہیں تو پھر ان عناصر میں اعتدال پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی بھی چیز زندگی کو پھر سے جوانی سے ہمکنار نہیں کر سکتی پھر عناصر کا بکھر جانا ہی فطری امر ہے۔

پروین شاکر کا یہ شعر دیکھیں:

دسترس میں ہیں عناصر کے ارادے کس کے
سو بکھر کے ہی رہا کوئی بکھرنے والا ۲۸

اک عذاب پیہم ہے ایسے دورِ وحشت میں
زندگی کے چہرے پر اپنا چشمِ تر ہونا ۲۹

نئی زندگی تیز تر ہے اور نئی دنیا دسترس سے باہر ہے۔ انسان پیچھے رہ گیا ہے اور دنیا آگے نکل گئی ہے۔ زندگی کا گھوڑا پہلے بھی بے قابو تھا اور اب تو وہ کچھ اور ہی آپے سے باہر نظر آتا ہے۔ غالب نے کہا تھا۔

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اور اس جدید دور میں پروین شاکر کے خیال میں اس گھوڑے کی کیفیت یہ ہے:

وہ ایڑ لگی رخشِ زمانہ کو کہ اب تو
اسوار سراسیمہ ہے راہوار کے آگے ۳۰

پروین شاکر کے خیال میں بھی زندگی معتبر نہیں ہے اور نہ کسی بھی طرح اس کو معتبر بنایا جا سکتا ہے۔ زندگی کو ثبات ہی نہیں ہے۔ زندگی کے سارے لوازمات اور وسائل مل کر بھی اس کی ناطاقتی اور بے ثباتی کا ازالہ نہیں کر سکتے۔

یہ بنی ہی ختم ہونے کے لیے ہے۔
پروین کا یہ شعر دیکھیں:

جو زیست کو معتبر بنا دے
ایسا کوئی سلسلہ نہیں ہے۳۱

انسان جو بھی سوچے، جتنی بھی منصوبہ بندی کرے لیکن حقیقت یہی ہے کہ ''سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں'' یہ زندگی ایک جھٹپٹا ہے، پلک جھپکنے کا وقفہ ہے۔

دعا کبھی میں نے مانگی تھی دونوں وقت ملتے
یہ زندگی بھر کا جھٹپٹا کب دھیان میں تھا۳۲

سلیم کاشر کے بغیر جدید پنجابی غزل کا تذکرہ مکمل نہیں ہوسکتا۔ان کی غزل میں زندگی کے تمام روایتی اور جدید موضوعات بڑی ہنرمندی اور فن کاری کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔سلیم کاشر نے طویل بحروں اور چھوٹی بحروں میں برابر اپنے فن شاعری کی عمدہ مثالیں قائم کی ہیں۔خلوص، جذبہ، محبت، دوستی، وفا، اپنے، بیگانے سب کے معیارات ان کی غزل میں قائم ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

زندگی اور دنیا کے بارے میں سلیم کاشر کا نظریہ اگرچہ روایتی ہے لیکن منفرد اندازِ بیان اور جذباتی کیفیت نے اس موضوع میں جدت اور نیا پن پیدا کر دیا ہے۔زندگی کی رفتار انسانی کارکردگی سے زیادہ تیز ہے۔انسان سارا دن اور ساری رات بھی اگر جان مارے تو پھر بھی زندگی کے معاملات کی تکمیل ممکن نہیں ہے۔روز شام کو اندازہ لگانے سے پتہ چلتا ہے کہ تمام تر مشقت اور محنت کے بعد بھی کچھ کام ادھورے رہ گئے ہیں۔اسی طرح زندگی گزر جاتی ہے اور انسان اس کے پیچھے دوڑتا دوڑتا بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔پھر انسان نے اپنی زندگی کے معیارات اتنے زیادہ اور بلند کر لیے ہیں کہ ان کو پورا کرنے کے لیے اور ان معیارات تک رسائی حاصل کرنے کے لیے انسان اگر مشین بھی بن جائے تو زندگی کا حق ادا نہیں کر سکتا۔لیکن اس کے باوجود جب تک زندگی ہے انسان اپنی بساط کے مطابق یا اس سے زیادہ زندگی اور دنیا کا ساتھ دینے کی کوشش کرتا ہے۔

سلیم کاشر اس حوالے سے لکھتے ہیں:

سنگ حیاتی ڈگدا ڈھہندا ویکھو ٹریا جانا واں میں
اک چکراے پیراں دیوچ کدھرے کدے وی بہہ نئیں سکیا۳۳

جب وقت کا دورانیہ کم ہو اور اس کے کم ہونے پر بھی اعتبار نہ ہو تو جو لمحہ دستیاب ہوتا ہے اس کی قدر و قیمت فطری طور پر اور بھی بڑھ جاتی ہے اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے اور اپنے مقصد کے استعمال میں جلدی کرنے کی سوچ اور صلاحیت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے۔چاہے انسان کی دنیا میں اور اپنی

زندگی میں ترجیح کچھ بھی ہو۔اس ترجیح کے حوالے سے انسان کا زیادہ سنجیدہ ہونا اس وقت کا تقاضا بن جاتا ہے۔

اج دی گھڑی غنیمت اڑیئے کل خورے مل بہیے نہ

میریاں ساہواں نال وٹا لے اپنیاں تکھیاں ساہواں نوں

اسی طرح اگر زندگی کی ترجیح دوسروں کے دکھ درد اور خدمتِ خلق ہے تو بھی ان چند لمحوں کو غنیمت سمجھتے ہوئے دوسروں کے لیے کچھ سوچنے اور کچھ کرنے میں دیر مناسب نہیں۔

سجناں دے دکھاں درداں وچ ہن دلجوئی ڈھونڈ

خورے کل ہووے نہ ہووے ایہہ یاراں دی ستھ ۳۴

وقت ایک ایسا دریا ہے جو اپنے فطری بہاؤ کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔رکتا نہیں ہے نہ کسی کا انتظار کرتا ہے۔انسان ہمت کر کے اس دریا کو پار کرنے کی سعی تو کرتا ہے لیکن زندگی کی امیدیں اور خواہشیں اتنی لامحدود ہیں کہ وہ پوری نہیں ہوتیں اور انسان کا یہ دریا پار کرنا ایک خواب بن کے رہ جاتا ہے۔بہت سی خواہشیں پوری ہونے کے باوجود کئی ارمان انسان کے دل میں رہ جاتے ہیں۔

سلیم کاشر لکھتے ہیں:

دس ویلے دا وگدا دریا کیکن تریئے اج

کانگاں آئیاں کھردا جاوے امیداں دا پُل ۳۵

دنیا کی بے ثباتی سے اردو اور پنجابی غزل میں عام طور پر انسان کے اندر مثبت تبدیلیوں کا اشارہ ملتا ہے۔ بہتری اور اصلاح کی طرف انسان مائل ہوتا نظر آتا ہے۔جب زندگی کی اصل حقیقت کا ادراک ہو جاتا ہے تو اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ تکبّر،غرور اور طاقت،عاجزی وانکساری میں بدل جاتی ہے۔جب انسان سمجھ جاتا ہے تمام تر شان وشوکت کے باوجود آخر مٹی میں مل جانا ہے تو اس کی شخصیت اور رویّے میں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔سلیم کاشر کا یہ شعر دیکھیں۔

دھرتی تے اسمان دا اک مک ہونا اکھ دا جھولا اے

نیویں ڈھارے والے اُچے بنیاں توں نئیں گُھوری دا ۳۶

سلیم کاشر کی غزل میں زندگی مجموعی طور پر ایک سفر ہے اور وہ بھی کڑی دھوپ کا سفر ہے جو طے کرنا بہت مشکل ہے۔پھر یہ سفر کسی بھی وقت اپنے انجام کو پہنچ سکتا ہے۔اس لیے اس میں رکنا،انتظار کرنا،ستانا یا غفلت کسی طور بھی حوصلہ افزا نہیں ہے۔غزل کا یہ مطلع دیکھیں۔

ایہہ زندگی اے اک سفر اوہ وی شکر دوپہر دا

سنگتاں دا سایہ عارضی ڈھل جاندا پل نئیں ٹھہردا ۳۷

یہ بات بھی عجیب ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے اور زندگی گزارتے ہوئے دنیا کی بے ثباتی کا احساس پختہ ہونا، اس حقیقت کا ادراک بہت کم لوگوں کو ہی ہوتا ہے۔ جیتے جی یہی لگتا ہے کہ شاید ہمیں موت نہیں آئے گی۔ جو جنازہ اٹھا ہے شاید وہ آخری ہے۔ انسان دنیا میں ایسے گم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی مال و دولت، جاہ و جلال اور تمام اسباب کو مستقل سمجھ بیٹھتا ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی بھول ہوتی ہے۔ سلیم کاشر لکھتے ہیں

ایہہ دنیا نئیں بنی کسے دی دعویدار بڑے ہو گزرے
تو وی من پرچا لے اپنا کجھ دن ناں دا پھٹا لا کے ۳۸

دنیا کی بے ثباتی اور کچے پن کا انسانی زندگی کے اوپر اثر مثبت ہو یا منفی، وہ اپنی اصلاح کرے، حرکت میں آ جائے، رشتوں کی پاسداری کرے، خدمت خلق کو شعار بنالے یا پھر زندگی کی بے اعتباری سے مایوس و مغموم ہو جائے، لیکن غزل کی روایت اور تاریخی حقائق کی روشنی میں دنیا چند لمحوں کا کھیل ہے۔ یہ کسی وقت بھی ختم ہو سکتا ہے۔ دنیا مختصر، اپنے مطلب کی، بے وفا اور بے اعتبار ہے اور جو اس کو حقیقی سمجھے اور اس پہ اعتبار کرے وہ یقیناً دھوکے میں اور حقیقت سے بہت دور ہے۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب نے زندگی اور دنیا کا بڑے فلسفیانہ انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ زندگی کے چہرے سے پردہ اُٹھایا ہے اور اس کی حقیقت سے جو آگاہی دی ہے وہی سچ ہے۔

غالب لکھتے ہیں:

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

لہٰذا قیامِ پاکستان کے بعد اردو اور پنجابی غزل میں دنیا کے حوالے سے اِسی روایتی نظریہ اور نقطہ نظر کو مانا گیا ہے اور اسی کی پاسداری کی گئی ہے۔ جدید اردو اور پنجابی غزل گو شعراء نے دنیا کی وسیع تر معنویت کے ساتھ دنیا کی بے ثباتی کے موضوع کو بھی اپنے اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔ سلیم کاشر کے اسی شعر سے پوری بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔

جگ سورج، توں شبنم ورگا
نبھنا نئیں ایہہ ساتھ مسافر ۳۹

حوالہ جات

۱۔ اسد اللہ خاں غالب،مرزا، دیوانِ غالب،کراچی: فضلی سنز،۱۹۹۷ء،ص ۵
۲۔ حیدر علی آتش،خواجہ،کلیاتِ آتش،مرتبہ سیّد مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی،لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۷۳ء، ص ۱۷۷
۳۔ ناصر کاظمی،کلیاتِ ناصر (برگِ نے) (لاہور: جہانگیر بکس،۱۹۷۲ء)،ص ۱۰۸،۱۰۹
۴۔ ایضاً،ص ۱۵۶
۵۔ ناصر کاظمی،کلیاتِ ناصر (دیوان)،(لاہور: جہانگیر بکس،۱۹۷۲ء)،ص ۲۹
۶۔ رؤف شیخ،کرناں،لاہور،ادارہ پنج رنگ،س۔ن،ص ۴۱
۷۔ ایضاً،ص ۱۲۷
۸۔ رؤف شیخ،چپ دا زہر،لاہور،ادارہ پنج رنگ،۱۹۸۳ء،ص ۲۱
۹۔ ایضاً،ص ۱۳۹
۱۰۔ رؤف شیخ،بلدا شہر،لاہور،ادارہ پنجاب رنگ، ۱۹۷۱ء،ص ۲۲
۱۱۔ ایضاً،ص ۸۸
۱۲۔ ایضاً،ص ۱۰۷
۱۳۔ جون ایلیا،گویا،لاہور،الحمد پبلیکیشنز، ۲۰۱۹ء،ص ۴۳
۱۴۔ ایضاً،ص ۵۲
۱۵۔ ایضاً،ص ۵۵
۱۶۔ ایضاً،ص ۶۴
۱۷۔ ایضاً،ص ۱۲۸
۱۸۔ ایضاً،ص ۱۶۰
۱۹۔ ایضاً،ص ۱۶۹
۲۰۔ ایضاً،ص ۲۲۱
۲۱۔ منظور وزیر آبادی،توں وی چن اچھال کوئی،لاہور،پنجابی ادبی سانجھ،۱۹۸۵ء،ص ۷۵
۲۲۔ ایضاً،ص ۷۷
۲۳۔ ایضاً،ص ۱۰۱
۲۴۔ منظور وزیر آبادی،ویلے ہتھ نیاں،لاہور،ادارہ پنجاب رنگ، ۱۹۷۸ء،ص ۱۲۴
۲۵۔ پروین شاکر،خود کلامی،مراد پبلیکیشنز،س۔ن،ص ۱۴
۲۶۔ ایضاً،ص ۲۵
۲۷۔ ایضاً،ص ۳۹
۲۸۔ ایضاً،ص ۵۷
۲۹۔ ایضاً،ص ۷۵
۳۰۔ ایضاً،ص ۱۱۸
۳۱۔ پروین شاکر،صد برگ،اسلام آباد،مراد پبلیکیشنز،۲۰۰۲ء،ص ۱۴۰

۳۲۔ ایضاً،ص ۲۱۱
۳۳۔ سلیم کاشر،سرگی دا تارا،لاہور،آئینہ ادب،۱۹۷۸ء،ص ۲۷
۳۴۔ ایضاً،ص ۲۸ ۳۵۔ ایضاً،ص ۸۵
۳۶۔ ایضاً،ص ۱۰۹
۳۷۔ سلیم کاشر،درداں دا کھڑیا موتیا،لاہور،عزیز بکڈپو، ۱۹۹۳ء،ص ۳۱
۳۸۔ ایضاً،ص،۱۴۰ ۳۹۔ ایضاً،ص،۱۴۹

مآخذ

۱۔ اسداللہ خاں غالب۔مرزا،دیوانِ غالب،کراچی:فضلی سنز،۱۹۹۷ء
۲۔ پروین شاکر۔خودکلامی،اسلام آباد:مراد پبلیکیشنز،س۔ن
۳۔ پروین شاکر۔صد برگ،اسلام آباد:مراد پبلیکیشنز،۲۰۰۲ء
۴۔ جون ایلیا۔گویا،لاہور:الحمد پبلیکیشنز،۲۰۱۹ء
۵۔ حیدرعلی آتش۔خواجہ،کلیاتِ آتش،مرتبہ سیّد مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی،لاہور:مجلس ترقی ادب،۱۹۷۳ء
۶۔ رؤف شیخ۔چپ دا زہر،لاہور:ادارہ پنج رنگ،۱۹۸۳ء
۷۔ رؤف شیخ۔بلدا شہر۔لاہور:ادارہ پنجاب رنگ،۱۹۷۱ء
۸۔ رؤف شیخ۔کرناں۔لاہور:ادارہ پنج رنگ،س۔ن
۹۔ سلیم کاشر۔درداں دا کھڑیا موتیا۔لاہور:عزیز بکڈپو،۱۹۹۳ء
۱۰۔ سلیم کاشر۔سرگی دا تارا/لاہور:آئینہ ادب،۱۹۷۸ء
۱۱۔ منظور وزیرآبادی۔توں وی چن اچھال کوئی۔لاہور:پنجابی ادبی سانجھ،۱۹۸۵ء
۱۲۔ منظور وزیرآبادی۔ویلے ہتھ نیاں۔لاہور:ادارہ پنجاب رنگ، ۱۹۷۸ء
۱۳۔ ناصر کاظمی۔کلیاتِ ناصر(برگِ نے)۔لاہور:جہانگیر بکس،۱۹۷۲ء
۱۴۔ ناصر کاظمی۔کلیاتِ ناصر(دیوان)۔لاہور:جہانگیر بکس،۱۹۷۲ء